باسمہ تعالیٰ

بتقریب یومِ اقبالؒ ــــ ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء

فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ ــــ قرآن

پرویز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ ـــــــ قرآن

علامہ اقبالؒ کو ان کی زندگی ہی میں جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، شاید ہی کسی اور مفکر یا شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے (یوں کہیئے گویا اپنی زندگی کے آخری سانس میں) کہا کہ:۔

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک ۔۔۔ ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر ۔۔۔ چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود (ارمغانِ حجاز۔ صفحہ ۱۹۹)

اُس وقت تو اسے عام طور پر شاعرانہ گلطرازی پر محمول کیا گیا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، اور گذرتا جا رہا ہے، یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا، شاعری نہیں تھی۔ ایک حقیقت تھی جس کا انہوں نے بصد درد و سوز اظہار کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد، ان کی فکر اور شعر، ان کے کلام اور پیام کے متعلق ہزاروں مقالات لکھے گئے اور سینکڑوں کتابیں شائع ہوئیں ـــــــ گذشتہ قریب چالیس سال کے طول طویل عرصہ کو تو چھوڑیئے، ۱۹۷۷ء کے ایک سال میں، جسے ان کی پیدائش کے صد سالہ جشن کے طور پر منایا گیا، ان موضوعات پر جس قدر کہا، لکھا اور شائع کیا گیا، وہ اعداد و شمار کے احاطہ میں بمشکل سما سکے گا۔ لیکن ارباب فکر و نظر اس کی تصدیق کریں گے کہ، اس کے باوجود، اقبالؒ نے اپنے آخری وقت میں جو کہا تھا وہ آج بھی اسی قدر مبنی بر حقیقت ہے جس قدر ان کی وفات کے وقت تھا۔ مطالعۂ اقبالؒ کے سلسلہ میں بنیادی طور پر یہ متعین کیا جانا ضروری تھا کہ ان کی فکر کا سرچشمہ کیا تھا۔ اس موضوع پر بھی آپ دیکھیں گے کہ کچھ کم نہیں لکھا گیا ـــــــ اس کے ڈانڈے کہیں "مغرب کے سیاروں" سے ملائے گئے، کہیں "مشرق کے ثوابت" سے ـــــــ لیکن اصل حقیقت کی طرف کسی کی نگاہ نہ اٹھی۔ حالانکہ اسے حضرت علامہؒ نے اپنی سب سے پہلی تصنیف ـــــــ مثنوی اسرار و رموز ـــــــ میں واضح الفاظ میں بتا دیا تھا۔ انہوں نے کتاب کے آخر میں، "عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ اللعالمین" کے زیرِ عنوان کہا تھا:۔

اقبالؒ کی اوّلیں دعا

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ۔۔۔ ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن　　ایں خیاباں را زِ خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم　　اہلِ ملت را نگہدار از شرم
سبز کشتِ نابسامانم مکن　　بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن
خشک گرداں بادہ در انگورِ من　　زہر ریز اندر مئے کافورِ من

اور اس کے بعد اپنے لئے وہ بددعا کہ جس سے زیادہ جگر پاش اور قلب سوز بددعا، اقبالؒ اپنے حق میں کر نہیں سکتا تھا۔ (اور میں تو اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اس بددعا کی ان میں ہمت کیسے پیدا ہو گئی، اور ان الفاظ کو وہ زبان تک کیسے لے آئے!) کہ:

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

"بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا" کی درد انگیزی اور جگر گدازی کا اندازہ وہ حضرات بخوبی لگا سکیں گے جنہیں اس کا علم ہے کہ حضورؐ نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ اقبالؒ کے عشق کی کیفیت کیا تھی۔ اقبالؒ کا، بحضور رحمتہ للعالمینؐ یہ عرضداشت پیش کرنا کہ، جو کچھ میں نے کہا ہے، اور جو کچھ میں کہوں، اگر اس میں غیرِ قرآن کچھ بھی مضمر ہو تو ——— بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا، اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس منفیانہ انداز کے بعد، انہوں نے مثبت طور پر کہا کہ:

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام　　با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است　　یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل　　عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ　　بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ
در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم، گہر گرداں مرا　　(رموز و اسرار۔ صفحہ ۱۹۵-۹۶)

اسی حقیقت کو وہ دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات　　در ضمیرش دیدہ ام، آبِ حیات
از نتب و تابم نصیبِ خود بگیر　　بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر
گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام　　شرحِ رمزِ صبغتہ اللہ گفتہ ام　　(مسافر۔ صفحہ ۴۳)

وہ، ارمغانِ حجاز میں، شعرائے عرب کو ایک پیغام دیتے ہیں کہ:

بگو از من نوا خوانِ عرب را　　بہائے کم نہادم لعلِ لب را
ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم　　سحر کردم صد و سی سالہ شب را　　(صفحہ ۱۱۴)

جاوید نامہ میں "نوائے سروش" کے زیرِ عنوان، کہتے ہیں:

چوں سرمہ رازی را از دیدہ فرو شستم　　تقدیرِ امم دیدم، پنہاں بکتاب اندر　　(صفحہ ۴۳)

اقبالؒ کے ہاں، کتاب سے مراد، کتابِ خداوندی، قرآنِ مجید ہی ہوتی ہے۔ بالِ جبریل میں کہتے ہیں:

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا — کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر (ص۴۷)

وہ بصد حسرت کہتے ہیں کہ :-

کس نمی داند ز اسرارِ کتاب — شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب (جاوید نامہ ص۵۶)

وہ انقلابِ روس کے بانیوں سے پہلے پوچھتے ہیں کہ :-

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے — جُستہ او را اساسِ محکمے؟

اور اس کے بعد انہیں کہتے ہیں کہ :-

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب (جاوید نامہ ص۵۸)

عظیم تحفہ

ان کی نگاہوں میں قرآنِ کریم کی عظمت کس قدر تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب وہ شاہِ افغانستان نادر شاہ (مرحوم) کی دعوت پر کابل تشریف لے گئے، تو ان کے لئے ایک ہی تحفہ اپنے ساتھ لے کر گئے۔ وہ تحفہ کیا تھا، فرماتے ہیں :-

در حضورِ آں مسلمانِ کریم! — ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم

گفتم ایں سرمایۂ اہلِ حق است — در ضمیرِ او حیاتِ مطلق است

اس کے جواب میں شاہِ مرحوم نے کہا :-

گفت "نادر در جہاں بیچارہ بود — از غمِ دین و وطن آوارہ بود

کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر — از غمانِ بے حسابم بے خبر

غیر قرآں غمگسارِ من نہ بود

قوّتش ہر باب را بر من کشود" (مسافر ص۱۵-۱۴)

وہ جب ستمبر ۱۹۳۱ء میں، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے عازمِ لندن ہوئے تو راستے میں کچھ وقت کے لئے دہلی رُکے۔ اہلِ دہلی نے ان کی خدمت میں بہت سے سپاسنامے پیش کئے۔ آپ نے جامع مسجد دہلی کے امام، شمس العلماء مولانا سید احمد (مرحوم) کے سپاسنامہ کے جواب میں فرمایا :-

جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے جو میرے لئے ضروری مواد فراہم کرے، نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر میں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں۔ میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآنِ پاک) ہے جس کی روشنی میں میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔ (گفتارِ اقبالؒ، از محمد رفیق افضل۔ ص۱۳۶)

اپنے مسلک کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے اور جس کو آپ نے آیت شریفہ کے حوالے سے بتایا ہے۔ (اقبالؒ نامہ۔ حصہ اول۔ ص۱۳۰)

ان چند تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اقبالؒ اپنی فکر اور پیغام کا سرچشمہ قرآنِ کریم بتاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ سوچیے کہ ہمیں ان کی فکر کی اساس کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے اس حقیقت

کو ایسے واضح انداز سے واشگاف کیا ہے کہ اس میں نہ کوئی ابہام ہے نہ التباس۔ نہ شک ہو سکتا ہے نہ ریب۔ یہ صحیح ہے کہ اقبالؒ بالآخر ایک انسان تھے اور اس جہت سے قرآن کریم کے مفہوم کے سمجھنے میں بعض اوقات ان سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور سہو بھی۔ انہوں نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا۔ میں نے قرآنِ مجید کے صحیح طور پر سمجھنے کا طریق خود حضرتِ علامہ سے سیکھا ہے۔ میرے دل میں ان کی جس قدر عظمت اور احترام ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے۔ لیکن اس کے باوجود، بعض مقامات پر، ان کی فکرِ قرآن سے میں بھی اختلاف رکھتا ہوں۔ اور اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دیگر قرآنی ذوق رکھنے والے حضرات بھی ان سے اختلاف کریں۔ لیکن اس کے باوجود، یہ حقیقت اپنے مقام پر محکم ہے کہ انہوں نے اپنی فکر کا سرچشمہ قرآنِ کریم ہی قرار دیا ہے، اور وہ ساری عمر قرآن ہی کے حقائق اور پیغام عام کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ ہماری حرماں نصیبی ہے کہ وہ قرآنِ مجید کے حقائق سے متعلق نثر میں کوئی کتاب نہ لکھ سکے۔ وہ مقدمۃ القرآن کے عنوان سے ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ان کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی۔ وہ جب علاج کی غرض سے، بھوپال تشریف لے گئے ہیں، تو انہوں نے (۲۲ جولائی ۱۹۳۰ء کو) تاثیر (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:-

> اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت دردمندی سے میرا علاج کرایا ہے۔ اس کے علاوہ، جب ان کو سرِ راس مسعود سے معلوم ہوا کہ میں ایک کتاب مقدمۃ القرآن لکھنا چاہتا ہوں تو اس ارادے کی تکمیل کے لئے مجھے انہوں نے تاحیات پانچ سو روپیہ ماہوار کی ٹریری پنشن عطا فرمائی ہے۔ آپ کو شاید اس کا علم اخباروں سے ہو گیا ہوگا۔ اب ذرا صحت اچھی ہو لے تو انشاء اللہ اس کتاب کو لکھنا شروع کرونگا۔
>
> (انوارِ اقبالؒ۔ بشیر احمد ڈار۔ صـ۲۰۵)

قوم کی بدقسمتی کہ ان کی صحت نے اس کی اجازت ہی نہ دی کہ وہ اپنی اس آرزو کو پورا کر سکتے۔ اگر وہ اس کتاب کو لکھ جاتے تو وہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایسی متاعِ گراں بہا ہوتی جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے زبانِ شعر میں بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن اس سے قرآنی حقائق مربوط شکل میں سامنے نہیں آ سکتے۔ دوسرے، شاعری میں تضاد بھی واقعہ ہو جاتا ہے۔ لطائف میں تو اس سے چنداں ہرج نہیں ہوتا لیکن حقائق کی صورت میں تضاد بہت بڑا نقص ہوتا ہے۔ قرآنی حقائق، مربوط شکل میں، بلا تضاد، نثری تخلیق ہی میں بیان کئے جا سکتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اور یہ ایک ایسا خلا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لئے ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ:-

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر — اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر (بانگِ درا)

اس مقام پر اس جرأتِ عرض کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس مردہ پرست قوم نے جس قدر اقبالؒ کے مزار کی تعمیر اور ان کے جشنِ پیدائش منانے پر صرف کیا ہے، اگر اس کا عشرِ عشیر بھی ان کے علاج اور سفر یورپ کے لئے مہیا کر دیتی تو نہ معلوم وہ کس قدر گہرہائے تابدار سے اس کی جھولیاں بھر دیتے۔ انہوں نے سچ کہا تھا کہ:-

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں — کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

(بالِ جبریل۔ صـ۱۹)

بہرحال، اس سے واضح ہے کہ فکرِ اقبالؒ کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آ سکتا تاوقتیکہ اس فکر کے سرچشمہ (قرآنِ مجید) پر گہری نظر نہ ہو۔

تلاوتِ قرآنِ پاک

حضرت علامہؒ، قرآنی حقائق پر غور و فکر میں تو ہر وقت مستغرق رہتے ہی تھے، لیکن اس کے ساتھ انہوں نے تلاوتِ قرآن پاک کا بھی عمر بھر التزام رکھا۔ فطرت نے انہیں لحنِ داؤدی عطا فرمایا تھا اس لئے ان کی قرأت میں بڑا سوز و گداز ہوتا تھا۔ اور اس سے وہ خود بھی کیف یاب و سرشار ہوتے تھے۔ عمر کے آخری دور میں ان کا گلا (قریب قریب) بند ہو گیا۔ اس کا انہیں ایک ہی صدمہ تھا۔ اور وہ یہ کہ:۔

در نفس سوزِ جگر باقی نماند　　لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

(پس چہ باید کرد ..... ص۶۸)

لیکن ان کی یہ 'تلاوت' لفظی طوطا خوانی نہیں ہوتی تھی۔ وہ رموز و غوامضِ قرآن کی گہرائیوں میں اترتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ بیان کیا جو انتہائی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہوا یوں کہ انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیرِ اہتمام (۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو) منعقد ہونے والے 'اقبال ڈے' کی تقریب میں شرکت کے لئے "اقبالیین" دہلی کا ایک قافلہ، زیرِ قیادت، علامہ حافظ اسلم جیراج پوریؒ لاہور آیا۔ اس میں میرے علاوہ، شیخ سراج الحق صاحب، اسد ملتانی (مرحوم) اور قاضی محمد اشرف (مرحوم) شامل تھے۔ ۱۰ جنوری کی صبح حضرت علامہؒ نے ہمیں شرفِ باریابی عطا فرمایا۔ اس محفل کی یاد میرے لئے سرمایۂ حیات ہے۔ محترمی سید نذیر نیازی نے اس کی روئداد اپنی کتاب "اقبالؒ کے حضور" میں بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ واقعہ زیرِ نظر کے سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے:۔

(حضرت علامہ نے فرمایا) میرا معمول تھا کہ ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دوران میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے، والد ماجد حسبِ معمول مسجد سے واپس آئے۔ میں تلاوت میں مصروف تھا۔ مگر وہ، جیسے کسی خیال میں میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ کہنے لگے، تم کیا پڑھا کرتے ہو؟ مجھے ان کے اس سوال پر نہایت تعجب ہوا، بلکہ ملال بھی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہرحال میں نے مؤدبانہ عرض کیا۔ قرآن پاک ..... کہنے لگے، تم جو کچھ پڑھتے ہو، سمجھتے بھی ہو۔ میں نے کہا، کیوں نہیں۔ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ انہوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ آخر اس سوال سے ان کا مطلب کیا ہے۔ کچھ دن گذر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ کا چھٹا روز تھا کہ میں صبح سویرے حسبِ معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انہوں نے مجھے بلایا اور

اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے۔ بیٹا! قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالتمآب ؐ کے بعد قرآنِ پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے۔ کہنے لگے، تمہیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآنِ مجید کسی پر نازل نہیں ہوگا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے وہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کروگے تو یہ تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ (اس کے بعد اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے، حضرت علامہؒ کے والد ماجد نے فرمایا) حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کا اسوۂ حسنہ و کاملہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لئے حجت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآن مجید اس کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پہ اس کا نزول ہو۔

(صفحہ ۶۰-۶۱)

مطلب یہ تھا کہ قرآن مجید کو محض ذہنی طور پر نہ سمجھا جائے بلکہ اس کے مقصود و منتہیٰ کو دل کی گہرائیوں میں پیوست کیا جائے۔ اس سے انسانی ذات میں عجیب تغیر واقع ہوگا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ تغیر کس حد تک پیدا ہو چکا ہے اور اس کی سمت کس طرف کو ہے، یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ حضور نبی اکرم ؐ کے اسوۂ حسنہ کے کس حد تک مطابق ہے۔ قرآن فہمی کے اسی مقصود کے متعلق حضرت علامہ نے کہا ہے کہ قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ: ؎

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود　　　جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود　　　(جاوید نامہ صفحہ ۹)

نزولِ کتاب

اسی کو آپ نے "نزولِ کتاب" سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ: ؎

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف　　　(بالِ جبریل صفحہ ۱۱۲)

دوسری جگہ کہا ہے: ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل　　　دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس میں ایک یہ نکتہ بھی پنہاں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے، نزولِ قرآن کے سلسلہ میں، قرآن کا مہبط، قلبِ نبوتؐ قرار دیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ: فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ۔ (۹۷/۲) "جبریل نے اسے تیرے قلب پر نازل کیا" لہٰذا جب قرآنی حقائق انسان کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں، تو اس وقت کہا جا سکے گا کہ قرآن گویا اس پر نازل ہو رہا ہے ـــــ یعنی اس کے ذہن سے اس کے قلب پر اتر رہا ہے۔ اس وقت انسان کے افکار و کردار، قرآن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ وہ "مردِ مسلمان" ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ: ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن　　　قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

(ضربِ کلیم۔ صفحہ ۵۰)

پھر یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم کے ذریعے، خدا اور بندے کے درمیان، عجیب و غریب تعلق پیدا ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کو وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی، حضرات انبیاء کرامؑ کے لئے مختص تھی اور اس کا سلسلہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ وحی کو خدا کی طرف سے ہم کلامی کہہ کر بھی پکارا گیا ہے جہاں کہا ہے ـــ

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ (۴/۱۶۴) اور اس نے قرآن مجید کو بھی كَلَامَ اللّٰهِ (۹/۶) کہا ہے۔ اب

خدا سے ہم کلامی

ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ (قرآن مجید میں) يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (بلکہ) يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا بندے سے ہم کلام ہوتا ہے۔ دوسری طرف، انسان جب خدا سے کوئی سوال کرتا ہے تو وہ (قرآن کریم کے ذریعے) اسے اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶) کا یہی مطلب ہے۔ لہٰذا قرآن کے ذریعے، انسان کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ اور یہ شرف بڑا عظیم ہے۔

واضح رہے کہ ختم نبوت کے بعد خدا، انسان سے صرف قرآن کریم کے ذریعے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس کے سوا خدا سے ہم کلامی کا کوئی طریق نہیں۔ کشف اور الہام وغیرہ کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔

بہرحال، علامہ اقبالؒ قرآن کی تلاوت اس انداز سے کرتے تھے کہ وہ شعور کے راستے قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتے۔ بایں ہمہ انہیں کشف و الہام کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ چونکہ کائناتی حوادث قوانین خداوندی کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں اور قرآن کریم میں غور و تدبر سے انسان ان قوانین کی کارفرمائی کو سمجھنے لگ جاتا ہے اس لئے اسے قرآنی شواہد سے آنے والے واقعات کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کو تدبر فی القرآن سے اسی قسم کی بصیرت حاصل تھی۔ اسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے ۔۔۔ عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

یہاں انہوں نے "آئینۂ ادراک" کہا ہے۔ (یعنی فکر و شعور)۔ کشف و الہام یا علم باطنی نہیں کہا۔

اب یہ دیکھئے کہ حضرت علامہ، قرآن مجید کا تعارف کس کس انداز سے کراتے ہیں۔ اس باب میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ کارگہ فکر میں ڈھلے ہوئے الفاظ نہیں جن کی نمود میکانکی طور

قرآن کا تعارف

پر ہو جاتی ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والے گہر ہائے آبدار ہیں جو جذب و کیف کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے، وجد آفرین و قلوب فراوان ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پہلی تصنیف ــــ "اسرار و رموز" ــــ میں کہتے ہیں: ؎

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ ۔۔۔ زیر گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ۔۔۔ حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات ۔۔۔ بے ثبات از قوّتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے ۔۔۔ آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
پختہ تر سودائے خام از زورِ او ۔۔۔ در فتد با سنگ جام از زورِ او
نوعِ انساں را پیامِ آخریں ۔۔۔ حاملِ او رحمۃٌ للعالمینؐ! (۱۴۲)

قرآنی آئین و نظام کے اتباع سے انسان کے اندر جو تبدیلی واقعہ ہوتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

خستہ باشی استوارت می کند ۔۔۔ پختہ مثلِ کوہسارت می کند

گر زمینی! آسماں سازد ترا آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

"آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا" ——— اس ایجاز میں جس قدر اطناب پوشیدہ ہیں، ان کا اندازہ ارباب نظر ہی لگا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قرآنی تعلیم کے اثمار و نتائج کے متعلق اس سے بہتر اور برجستہ شاید ہی کچھ اور کہا جا سکے۔ اس میں مشیتِ خداوندی کے مقصود و مطلوب کی پوری دنیا سمٹ کر آگئی ہے ——— آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا ———

گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

"اسرار و رموز" ہی میں دوسری جگہ کہتے ہیں:-

قلب مومن را کتابش قوت است حکمتش حبل الورید ملت است (رمزؔ ۱۱)

قرآن، انفرادی طور پر کس قسم کی قلبِ ماہیت پیدا کرتا ہے، اور امت کی اجتماعی زندگی میں کس قدر محکمیت کا ضامن بنتا ہے، اس ایک شعر میں دونوں خصوصیات سمو کر رکھ دی گئی ہیں۔

وہ، مثنوی مسافر میں رقمطراز ہیں:-

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آب حیات

می دھد ما را پیام لاتخف می رساند بر مقام لاتخف (رمزؔ ۳۴)

حضرات انبیاء کرامؑ، عظیم آسمانی انقلاب کے داعی ہوتے تھے۔ ان کی انقلابی دعوت کے خلاف، مفاد پرست قوتیں ہجوم کر کے امڈ آتی تھیں۔ ان کے ساتھ تزاحم و تخاصم کی ہنگامہ آرائیاں بڑی ہمت طلب اور صبر آزما ہوتی تھیں۔ ان مقامات پر انہیں خدا کی طرف سے سکینت و طمانیت قلب کے اس قسم کے پیغامات موجبِ حوصلہ افزائی ہوتے تھے کہ: لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ۔ (۲۰/۶۸) "تم خوف زدہ مت ہو، آخرالامر تم ہی غالب آؤ گے۔"

کم و بیش یہی الفاظ قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین کے لئے کہے ہیں۔ ان سے کہا ہے کہ ہجومِ مشکلات سے گھبراؤ نہیں، لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔ (۳/۱۳۹) "جب تمہارا قرآن کی صداقتوں پر ایمان ہے تو پھر گھبرانے اور خوف کھانے کی کونسی بات ہے۔ تم ثابت قدم رہو۔ آخرالامر تمہیں غالب آؤ گے۔"

قرآن کی عظمت

انہوں نے جاوید نامہ میں، قرآنِ کریم کی حقیقت و عظمت کو بڑے وجد آفریں انداز میں بیان کیا ہے:-

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست۔ چیزے دیگر است

قرآنِ مجید کے تفصیلی تذکرہ کے لئے اگر ضخیم تصنیفات بھی قلم بند کی جائیں، تو جو بات "چیزے دیگر است" میں کہی گئی وہ ان ضخیم مجلدات میں بھی سما نہ سکے۔ اس جامعیت میں تو حقائق و رموز کی ایک دنیا جھلمل جھلمل کر رہی ہے یہ وہ آنکھ کی پتلی (مردم دیدہ) ہے جس میں آسمان سمٹ کر آجاتا ہے۔ امیر خسروؔ نے اپنے محبوب کے متعلق کہا تھا کہ:-

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام! بسیار خوباں دیدہ ام، اما تو چیزے دیگری

اقبالؒ نے یہی الفاظ قرآن کے متعلق کہہ کر، بتا دیا کہ اس کا محبوب کون ہے، اور کیا ہے؛ اس شعر کو پھر پڑھئے کیونکہ

اس کا مفہوم اُس شعر کو ساتھ ملانے سے نمایاں ہو سکے گا جو اس کے بعد آیا ہے :-

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　　ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود　　　جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود　　　(صفحہ ۹)

"جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود"۔ قرآنِ کریم کے ایک عظیم فلسفۂ حیات و لائحۂ انقلاب کی تفسیر ہے۔ اس نے قوموں کی زندگی میں انقلاب آفرینی کا راز یہ بتایا ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ (۱۳/۱۱) یاد رکھو! (تم خود تو کجا) خدا بھی کسی قوم کے احوال و ظروف میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ قوم کی خارجی دنیا میں انقلاب آ نہیں سکتا جب تک وہ اپنی داخلی دنیا میں ——— انقلاب نہ پیدا کر لے۔ جب تک کسی قوم کے قلب و دماغ، اس کی فکر و نظر، اس کے تصورات و تخیلات، اس کی اقدارِ حیات، اس کے نصب العین زندگی میں تبدیلی نہیں پیدا ہو جاتی، اس کی خارجی دنیا میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ قوموں کی خارجی دنیا، ان کی داخلی دنیا کے سانچے میں ڈھلتی ہے جس قسم کی ان کی داخلی دنیا، اسی قسم کی ان کی خارجی دنیا۔ علامہ اقبالؒ پیامِ مشرق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو"۔ بنا بریں جب قرآنی اقدار کسی قوم کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں، تو اس کی خارجی دنیا میں انقلاب آ جاتا ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　　جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

اندرو تقدیرہائے غرب و شرق　　　سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق　　　(صفحہ ۹۱)

قرآن کی بیان کردہ "تقدیرات" کے سمجھنے کے لئے سرعتِ اندیشہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ :-

جہانِ تازہ کی، افکارِ تازہ سے ہے نمود　　　کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

جاوید نامہ ہی میں دوسری جگہ کہتے ہیں :-

چوں مسلماناں اگر داری جگر　　　در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست　　　عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

یک جہانش عصرِ حاضر را بس است　　　گیر اگر در سینہ دل معنی رس است

بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست　　　ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا ست

چوں کہن گردد جہانے در برش

می دہد قرآں جہانے دیگرش　　　(صفحہ ۷۳-۷۲)

ان آیات میں، جس حسن کارانہ اور معجزانہ انداز سے قرآن کی ابدیت کی وضاحت کی گئی ہے، جوں جوں انسان اس پر غور کرتا ہے، اس کی روح وجد میں آ جاتی ہے۔ یہ نکتہ ذرا تشریح کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے، نوعِ انسان کو منزلِ انسانیت تک لے جانے والے راستے کی طرف راہنمائی اپنے ذمہ لی اور اس کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا۔ جب نوعِ انسان عالمِ طفولیت میں تھی تو اس پروگرام کی صورت یہ تھی کہ اس میں

آسمانی ہدایت کی ابدیت

اصولی ہدایات کم ہوتی تھیں اور عملی جزئیات زیادہ ——— اس زمانے میں تو حالت یہ تھی کہ حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا طریق بھی بذریعہ وحی بتانا پڑا۔ جوں جوں نوعِ انسان عمر میں بڑھتی گئی اور اس کا شعور پختہ ہونا شروع ..... ہوا تو اس پروگرام کی جزئیات میں کمی اور اصولوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ تا آنکہ جب وہ عالمِ شباب تک پہنچ گئی اور مشیت نے دیکھ لیا کہ اب انسان اصولوں کی روشنی میں، اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود مرتب کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ تو اس نے ان تمام اصولوں کو جن کی انسانی راہ نمائی کے لئے ضرورت تھی مکمل شکل میں، وحی کے آخری ضابطہ، قرآنِ کریم میں محفوظ کر دیا، اور سلسلۂ وحی اختتام تک پہنچ گیا۔ (ختمِ نبوت کے یہی معنی ہیں)۔ اب انسانوں کے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن میں غور کریں کہ اس نے، ان کے حل کے لئے کیا اصول دیا ہے اور اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے خود وضع کریں۔ اس طرح یہ کتابِ ہدیٰ قیامت تک انسانی راہ نمائی کا فریضہ ادا کرتی رہے گی۔ یہ کہیں نہیں کہے گی کہ مجھ میں راہ نمائی دینے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے اس طریق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ نے کہا ہے کہ: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱/۵۳) "ہم" انہیں (نوعِ انسان کو) خارجی کائنات اور خود ان کی داخلی زندگی میں اپنی "نشانیاں" دکھاتے جائیں گے۔ تا آنکہ ان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ صداقت پر مبنی ہے" یعنی جوں جوں علمِ انسانی آگے بڑھتا جائے گا، قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ ایسا ہو سکتا ہے (اور ہوتا ہے) کہ عقل و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کی رو سے جن حقائق کا ادراک ہو، انسان انہیں قرآن کے حوالے سے پیش نہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہونگے قرآنی حقائق ہی۔ اس لئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ یہ عالمِ انفس و آفاق میں کوئی حقیقت بے نقاب ہو، اور وہ قرآن کے خلاف جائے۔ ہماری اس ملاقات میں جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کو بڑے لطیف اور دقیق انداز سے ارشاد فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ:-

> قرآنی حقائق کے دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب ہے حقائق کا ادراک، علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں۔ حقائق کا ادراک ہمیشہ سے جاری تھا۔ کبھی ایک حقیقت سمجھ میں آئی کبھی دوسری، کبھی جزءً کبھی تماماً۔ اب اگر انسان وہ سب حقائق جو اس نے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں حاصل کئے ہیں۔ یا جن تک عقل اور فکر کے ذریعے اس کی رسائی ہوئی، باہم فراہم کر لے اور ایک مربوط و منظم شکل میں پیش کرے تو ان سے قرآنِ پاک ہی کے ارشادات کی تصدیق اور ترجمانی ہو گی۔

اس کے بعد قدرے توقف سے فرمایا:-

> حقائق کا ادراک ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ قرآنِ مجید ان سب حقائق کا جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آ چکے ہیں۔ اور ان کا بھی جن کا ادراک باقی ہے۔ خواہ یہ حقائق سنوسی کی زبان سے ادا ہوں، خواہ لینن کی۔ حقائق بہرحال حقائق ہیں۔ ان کو سمجھنے کی جس طرح بھی کوشش کی جائے اپنی جگہ پر ٹھیک

ہے، مقصد ان کا سمجھنا ہے اور قبول کرنا ہے۔ لہٰذا، انہیں جس طرح بھی سمجھیں یہ قرآن پاک ہی کا سمجھنا ہوگا اس کی تعلیم سے بہرہ ور ہونا ہوگا۔ (اقبالؒ کے حضور۔ صفحہ ۵۸-۵۷)

اسی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان عمیق الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو	آنکہ از خاکش بروید آرزو !
یاز نورِ مصطفےٰ او را بہاست	یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

یہ نورِ مصطفےٰ وہی ہے جو حضورؐ نبی اکرم کی وساطت سے دنیا کو ملا اور اب قندیلِ قرآنی میں محفوظ ہے۔ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ۔ (۲۴/۳۵)۔

ان تشریحات کی روشنی میں، جاوید نامہ کے ان اشعار کا مطلب سمجھ میں آجائے گا، جنہیں میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے کہ: ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست	عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست
چوں کہن گردد جہانے در برش	می دہد قرآں جہانے دیگرش

اس طرح قرآن کے اصول و حقائق، ہر زمانے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کرتے، اور انسانی کی زندگی کے ہر مشکل مسئلہ کا حل بتاتے، کاروانِ انسانیت کے راہ نما بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کسی مقام پر اس کی راہ نمائی سے عاجز نہیں آتے۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے، گوئٹے نے، ایکرمن کو ان الفاظ میں سمجھایا تھا کہ:

اسلام کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام نہیں رہتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے حیات کے ساتھ، اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ اور اصل تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

(خطباتِ اقبالؒ۔ صفحہ ۸)

یہ ہے قرآن کی ابدیت!

قرآنی انقلاب

یہاں تک تو قرآنی حقائق سے بحث تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان حقائق، یا قرآنی اصولِ حیات سے نوعِ انسان کو حاصل کیا ہوا؛ ان کے اتباع سے نتیجہ کیا مرتب ہوا، اور کیا مرتب ہوگا۔ اس اہم سوال کا جواب، علامہ اقبالؒ نے دو لفظوں میں نہایت جامعیت سے دیا ہے جہاں کہا کہ: ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ	دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ	(جاوید نامہ۔ صفحہ ۸۹)

”خواجہ را پیغامِ مرگ“ کا مطلب یہ ہے قرآن نے، انسانوں پر دوسرے انسانوں کی ہر قسم کی بالادستی کا خاتمہ کر دیا۔
اسی حقیقت کو انہوں نے، ”ابلیس کی مجلسِ شوریٰ“ میں، ابلیس کی زبان سے ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ: ؎

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے	نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف	منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!	بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

(ارمغانِ حجاز۔ صفحہ ۲۲۵)

اب آگے بڑھیئے۔ حضرت علامہ اس حقیقت کو شرح و بسط سے واضح کرتے ہیں کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے جس قدر قوت و حشمت۔ دولت و ثروت۔ شوکت و مملکت۔ رفعت و عظمت اور ان سب کے ساتھ، شرف و مجدِ انسانیت کے مقاماتِ بلند حاصل کئے تو وہ سب اتباعِ قرآن کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد اس قوم نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر "عجمی اسلام" اختیار کر لیا تو اس کی وہ حالت ہو گئی جس کا ہم سب رونا روتے ہیں۔ اقبالؒ کو امتِ مرحومہ کے ساتھ والہانہ محبت تھی۔ اس محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ اس کی نکبت و زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ انہوں نے اس موضوع

امت کی تاریخ

پر اس قدر شدت و تکرار سے لکھا ہے کہ اس سے ایک مستقل تصنیف وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن میں اس وقت ان میں سے صرف وہ مقامات پیش کروں گا جن میں انہوں نے براہِ راست قرآن کے حوالے سے بات کی ہے۔ وہ پہلے کہتے ہیں کہ:

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقش ہائے کاہن و پاپا شکست (جاوید نامہ ص۹)

اس کے بعد کیا ہوا، غور سے سنئے۔ پہلے اس حقیقت کو با صد حسرت پیش کرتے ہیں کہ:

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است!
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفےٰ در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں برنخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد

اس کے بعد کہتے ہیں کہ کس قدر مقامِ حیرت و تاسف ہے کہ:

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و راہ گردد دگر (جاوید نامہ۔ ص۸۷)

اس قوم میں اس محیر العقول تبدیلی کا راز، اس ایک نکتہ میں پنہاں ہے کہ ان کی خلافت ملوکیت میں بدل گئی۔ خلافت نے انہیں، ہر نوع غلامی سے رستگاری عطا کر دی تھی، ملوکیت نے ان کی آزادی کو سلب کر لیا:

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت (اسرار و رموز۔ ص۱۲۷)

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق — مومن و غداری و فقر و نفاق!
با پشیزے دین و ملت را فروخت — ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت
لا الٰہ اندر نمازش بود و نیست — ناز ہا اندر نیازش بود و نیست
نور در صوم و صلوٰتِ او نماند — جلوۂ در کائناتِ او نماند
روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام — فرد ناہموار و ملت بے نظام
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی — از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی!
ہر کسے بر جادۂ خود تند رَو — ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دَو

واحسرتا کہ:

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب　　العجب۔ ثم العجب۔ ثم العجب!

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۳۶-۲۳۵)

وہ کہتے ہیں کہ سوچئے کہ یہ بات کس قدر ناقابلِ فہم ہے کہ جس قوم کے پاس ایسی کتاب زندہ موجود ہو، وہ قوم مردہ ہو! وہ بصد حیرت کہتے ہیں کہ:

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کرد　　یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد؟　　(جاوید نامہ۔ صفحہ ۲۴)

وہ مسلمان سے کہتے ہیں:

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز　　دگرگوں گشتۂ! از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را　　قیامت ہائے پیشیں را برانگیز!　　(ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۰۱)

تحریکِ پاکستان کے دوران ایک عجیب حیرت افزا اور دل خراش حقیقت سامنے آئی۔ ہندوؤں کا سب سے بڑا لیڈر، (مہاتما) گاندھی تھا جس کی تمام تگ و تاز کا مقصد قدیم ہندو دھرم کا احیاء تھا۔ اس کے مقابلے میں، قومیت پرست مسلمان لیڈروں کی حالت یہ تھی کہ وہ اسلام کے ایک ایک بنیادی عنصر کو خیرباد کہتے چلے جاتے تھے۔ کہیں ڈاکٹر سید محمود اور آصف علی نما لیڈر تھے جو مذہب کو داستانِ پارینہ قرار دیتے تھے۔ کہیں ڈاکٹر ذاکر حسین خان جیسے ماہرینِ تعلیم تھے جو مہاتما گاندھی کے تجویز کردہ خطوط پر "داردھا کی تعلیمی اسکیم" مرتب فرما رہے تھے۔ کہیں (امام الہند، مولانا) ابوالکلام آزاد تھے جو اسلام کا برہمو سماجی ایڈیشن پیش کر رہے تھے۔ کہیں (شیخ الحدیث، مولانا) حسین احمد مدنی جیسے علماء کرام تھے جو متحدہ قومیت اور سیکولرازم کو عین مطابقِ اسلام قرار دے رہے تھے۔ یہ تھی وہ سینہ سوز حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ نے بصد نالہ و فغاں کہا تھا کہ:

درِ صد فتنہ را بر خود کشادی　　دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست　　تو قرآں را سرِ طاقے نہادی　　(ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۳۶)

اور یہ کہ:

نگہ دارد برہمن کارِ خود را　　نمی گوید بکس اسرارِ خود را!
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر　　بدوشِ خود برد زنّارِ خود را　　(ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۳۷)

مُلّا اور قرآن

میرے نزدیک حضرت علامہ کا سب سے بڑا اور معرکہ آرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بکمال جرأت و جسارت اس حقیقت کو طشت از بام کیا کہ امت کو قرآن سے برگشتہ کرنے کی بنیادی ذمہ داری ہماری مذہبی پیشوائیت پر عائد ہوتی ہے جسے وہ ملّا کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہوں نے مُلّا کے خلاف جو کچھ کہا ہے وہ کسی خاص مُلّا یا طبقۂ علماء کے خلاف نہیں۔ وہ مذہبی پیشوائیت کی (INSTITUTION) کے خلاف ہے۔ جس نے اسلام کو کچھ کا کچھ بنا دیا اور اُمت کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ عنوان، ایک مستقل موضوع ہے جسے میں کسی دوسری نشست پر اٹھا رکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت میں اس کے ان چند ایک ضمنی گوشوں کو سامنے لاؤں گا جن کا تعلق براہِ راست

قرآن سے ہے۔ وہ جاوید نامہ میں، سعید حلیم پاشا کی زبان سے کہتے ہیں:

دینِ حق از کافری رسوا تر است ۔۔۔ زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است!
شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است ۔۔۔ از نگاہِ او یمِ ما شبنم است!
از شگرفیہائے آں قرآں فروش ۔۔۔ دیدہ ام روح الامیں را در خروش
زانسوئے گردوں دلش بیگانہ! ۔۔۔ نزدِ او ام الکتاب افسانہ!
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ ۔۔۔ آسمانش تیرہ از بے کوکبی!
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ۔۔۔ ملت از قال و اقولش فرد فرد!

حد یہ کہ:

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب ۔۔۔ کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب!

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد! (جاوید نامہ۔ ص ۸۴)

وہ، مثنوی "پس چہ باید کرد" میں کہتے ہیں:

مکتب و مُلّا سخنہا ساختند ۔۔۔ مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود، از تاویل مُرد ۔۔۔ آتشِ او در ضمیرِ او فسرد
ہر یکے دانائے قرآن و خبر ۔۔۔ در شریعت کم سواد و کم نظر
عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس ۔۔۔ منبرِ شاں منبرِ کاک است و بس
ایں کلیماں نیست امید کشود ۔۔۔ آستیں با بے یدِ بیضا چہ سُود (ص ۴۲-۴۱)

ان کی تاویل کے متعلق کہتے ہیں:

زمن بر صوفی و مُلّا سلامے ۔۔۔ کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت ۔۔۔ خدا و جبرئیل و مصطفےٰؐ را (ارمغانِ حجاز ص ۱۰۱)

اس کی تشریح ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں ۔۔۔ ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق (ص ۱۳)

ان کی ان تاویلات و تغیّرات کا نتیجہ ہے کہ:

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم ۔۔۔ جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیں
"تن بہ تقدیر" ہے آج ان کے عمل کا انداز ۔۔۔ تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر!
تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی "خوب" ہوا ۔۔۔ کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر (ضربِ کلیم ص ۸)

پیغام بہ ملّت

ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی قرآن کے خلاف سازش کا تار و پود بکھیرنے کے بعد، وہ مسلمانوں سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں اور اسے دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں کہ:

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو　　شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بقرآں زیستن

قرآن کریم نے، کتاب و حکمت ——— یعنی قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت کو منزل من اللہ بتایا ہے جو علم و عقل کی رو سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی قرآن، مجموعہ ہے کتاب و حکمت کا۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے مسافر میں کہا ہے:؎

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است　　ایں دو قوت اعتبارِ ملت است
آں فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق　　ایں فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
ہر دو انعامِ خدائے لایزال　　مومناں را آں جمال است ایں جلال

اس کے بعد وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں:؎

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات　　در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد ما را پیامِ لاتخف　　می رساند بر مقامِ لاتخف　　(مسافر۔ ص۴۳)

وہ خصوصیت سے مغرب زدہ[1] مسلمان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:؎

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو　　دامنِ قرآں بگیر، آزاد شو　　(جاوید نامہ۔ ص۸۰)

دین و مذہب

اب ہم اس موضوع کی طرف آتے ہیں جو فکرِ اقبالؒ میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی تو اس سے اسلام پر کیا اثر پڑا؟ بہ نظر بظاہر یہ محض سیاسی نظام کی تبدیلی تھی۔ لیکن یہ ——— محض سیاسی نظام کی تبدیلی نہیں تھی۔ اس سے اسلام ہی باقی نہیں رہا۔ اسلام' ایک دین ہے (اور دین بھی دین اللہ)۔ ملوکیت سے' یہ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مذہب نام ہے، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا جو (مذہب پرست طبقہ کے عقیدہ کے مطابق) پوجا پاٹ۔ گیان دھیان۔ بھگتی اور پرستش کی رو سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے پہچاننے اور ماپنے کا کوئی خارجی اور محسوس معیار نہیں۔ یہ خالص انفرادی احساس کا نام ہے۔ اس کے برعکس، دین اس نظامِ حیات کا نام ہے جس میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رو سے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دین کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ امتِ مسلمہ کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں احکام و اصول و اقدارِ قرآنی کو قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کیا جا سکے۔ اس مملکت کو قرآنی اصطلاح میں "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے۔ (۲۴/۵۵) جس کا مخفف "خلافت" ہے۔ قانون محض الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسے ایک مؤثر حقیقت اور زندہ نظام بنانے کے لئے قوتِ نافذہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قانون کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے کتاب کے ساتھ حدید (فولاد یعنی شمشیر) کو بھی منزل من اللہ کہا ہے۔ سورۂ حدید کی آیت ۲۵ بڑی معنی خیز ہے۔ فرمایا: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا

---

[1] "اقبالؒ اور تہذیبِ مغرب" الگ موضوع ہے جس پر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

بِالْبَيِّنٰتِ ۔" ہم نے رسولوں کو واضح دلائل و براہین کے ساتھ بھیجا۔ یعنی ہدایتِ خداوندی کے نافذ العمل کرنے کی پہلی منزل یہ ہے کہ اسے دلیل و برہان کی رو سے پیش کیا جائے۔ جو لوگ، علم و عقل اور غور و تدبر کے بعد اس کی صداقت کو تسلیم کر لیں، انہیں ضابطۂ قوانین کے تابع لایا جائے۔ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ ۔" اور ان رسولوں کے ساتھ ہم نے کتاب (ضابطۂ قوانین) بھی نازل کی۔" اس سے مقصد کیا تھا؟ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے معاملات کو از روئے عدل و انصاف طے کیا جائے لیکن عدل کا قیام اسی صورت میں ممکن ہوگا جب اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے قوت بھی موجود ہو۔ اس کے لئے فرمایا: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ...... ($\frac{57}{25}$) اور اس مقصد کے لئے ہم نے فولاد (شمشیر) بھی نازل کی۔

قرآن اور شمشیر

اس میں سختی بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے منفعت بھی۔ اس کی سختی سے ظالم کو ظلم سے روکا جاتا ہے، اور مظلوم کی دادرسی ہوتی ہے جو اس کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اُمتِ مسلمہ کو اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد دلائی کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ اور دین کے معنی ہیں ایسی آزاد مملکت جو قوانینِ خداوندی کی تنفیذ کے لئے وجود میں لائی جائے۔ انہوں نے پاکستان کا تصور اور مطالبہ اسی مقصد کے لئے پیش کیا تھا۔

مملکت کے لئے دو بنیادی عناصر لاینفک ہیں —— قوانین اور قوتِ نافذہ۔ جہاں تک قوت کا تعلق ہے اقبالؒ نے اس سلسلہ میں ایسا پیغام دیا ہے جس میں اسلام کی پوری کی پوری غرض و غایت سمٹ کر آجاتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ قرآن اور تلوار ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ تیغ کی اس لئے ضرورت ہے کہ قرآن کے قوانین کو عملاً نافذ کیا جا سکے۔ اور قرآن کی اس لئے کہ وہ تیغ (قوت) کو بے باک نہ ہونے دے۔ اسے حدودِ خداوندی کے اندر رکھ کر استعمال کیا جائے۔ ضربِ کلیمؔ کی وہ مشہور نظم، جس کا عنوان ہی "قوت اور دین" ہے، ان کے اس پیغام کی مظہر ہے ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک (ص۲۳)

دوسرے مقام پر اس شمشیر کے متعلق، جو دین کی حفاظت کے لئے استعمال کی جائے، کہتے ہیں کہ: ؎

اُس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار (ص۲۱)

ان کے اس مشہور شعر: ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(بالِ جبریل۔ ص۶۲)

ہیں، سیاست سے مراد، اقتدارِ مملکت ہے اور دین سے مراد، حدودِ خداوندی یا قرآنی اقدار و اصول۔

لیکن اس قسم کے اشعار کے علاوہ، انہوں نے قرآن اور تیغ کے باہمی رشتے کو جاوید نامہ میں' (محترمہ خاتون)... شرف النساء کی زبان سے' جس حسین اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے' اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ شرف النساء' قرآن پاک کی تلاوت کرتیں تو تلوار کو اپنی کمر کے ساتھ پیوست رکھتیں۔ یہ اس کا زندگی بھر کا شعار تھا۔ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو؎

برلبِ او چوں دمِ آخر رسید سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند!
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن تیغ و قرآں را جدا از من مکن

مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۱۸۲-۸۳)

انہوں نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں، مومن حکمران کے متعلق کہا ہے کہ؎

حکمرانے بود و سامانے نداشت دستِ او جز تیغ و قرآنے نداشت (صفحہ)

جاوید نامہ میں انہوں نے ملک مظفر کے قصہ کے ضمن میں کہا ہے کہ؎

مردِ مومن را عزیز اے لکتہ رس چیست جز قرآن و شمشیر و فرس؟ (صفحہ ۲۲۰)

میں اسے دہرا دوں کہ قرآن و شمشیر کے باہمی رشتہ کے متعلق یہ کہہ کر کہ "ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند" اسلام کی جامع تفسیر بیان کر دی گئی ہے۔ اسلام اسی کا نام ہے ۔۔ تلوار، قرآن کی حفاظت کرے اور قرآن' تلوار کی۔

اور اب ہم سورۂ حدید کی متعلقہ آیت (۵۷/۲۵) کے پہلے حصے کی طرف آتے ہیں۔ یعنی کتاب۔ (ضابطۂ قوانین) ۔۔ علامہ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو یہ حقیقت ان کے پیشِ نظر تھی کہ اس مملکت میں سب سے اہم

قانون سازی

سوال قانون سازی کا ہوگا۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ اس قدر مشکل ہو! جس اُمت کے پاس خدا کی کتاب اپنی حقیقی اور غیر محرف شکل میں موجود ہو، اس کے لئے اپنی (اسلامی) مملکت میں قوانین مرتب کرنے میں کونسی دشواری پیش آسکتی ہے؟ لیکن جاننے والے جانتے ہیں ــــــ اور پاکستان کی تیس سالہ تاریخ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ بحالاتِ موجودہ، اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا مسئلہ دشوار ترین بلکہ لاینحل ہے۔ یہ اس لئے کہ امت مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر فرقہ کا ضابطۂ قوانینِ شریعت اپنا اپنا اور الگ الگ ہے، اور کوئی فرقہ، اپنی فقہ کو چھوڑنا تو ایک طرف، اس میں ذرا سے ردّ و بدل کے لئے بھی تیار نہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی واضح اور مسلمہ ہے کہ ایک مملکت اسی صورت میں مملکت بن سکتی اور قائم رہ سکتی ہے جب اس میں ایک ضابطۂ قوانین نافذ ہو جس کا اطلاق تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہو۔ سیکولر حکومتوں نے اس کا حل یہ تجویز اور اختیار کیا کہ مختلف فرقوں کو اس کی اجازت

دے دی کہ وہ شخصی معاملات کے لئے اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور پبلک لاز (مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) حکومت خود مرتب کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام کو کبھی اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ اول اس لئے کہ قرآن کی رو سے، پرسنل لاز اور پبلک لاز میں کسی قسم کی تفریق اور تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے جسے پرائیویٹ اور پبلک سیکٹروں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اس لئے کہ پرائیویٹ سیکٹر ہو یا پبلک، اسلامی حکومت اس کی مجاز ہی نہیں کہ وہ بلا حدود و قیود (عام اصطلاح میں، مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) قوانین مرتب کر سکے۔ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے ہی قوانین مرتب کر سکتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اس اہم ترین (اور بظاہر مشکل ترین) مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ اسلامی مملکت میں قوانین کی بنیاد خدا کی کتاب، قرآن مجید قرار پاتی ہے۔ جو قوانین اس بنیاد پر مرتب ہوں گے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ ان میں نہ پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ہوگی، نہ فرقوں کی تخصیص۔ ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ انہوں نے اس سوال پر، تصورِ پاکستان پیش کرنے کے بعد ہی غور نہیں فرمایا۔ یہ بہت پہلے سے ان کی فکر و تدبر کا مرکز تھا۔ (مثلاً) امرتسر میں اہل قرآن کی ایک جماعت تھی جس کے سربراہ، خواجہ احمد دین (مرحوم) تھے۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے کہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) حضرتِ علامہ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ قرآنی قوانین مرتب کرنے کے سلسلہ میں خواجہ صاحب کے ساتھ تبادلۂ خیالات مفید ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں علامہؒ نے صوفی صاحب کو ایک مفصل خط لکھا، جو (تمہید حذف کرنے کے بعد) درج ذیل کیا جاتا ہے۔ فرمایا:-

> مجھ کو اُن کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدؐیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں، جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ "معاملات" کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں۔ اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے، اس میں زیادہ تر زمانہ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کر فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ الگ کر دیا ہے، اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامیہ کے لئے باعث برکت ہوگا یا شقاوت۔ غرض کہ مولوی صاحب موصوف یا اُن کے رفقا کو جو کلامِ الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں، اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ ... "اشاعت القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور

اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں، اُن پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے "جورس پروڈنس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کریگا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے، مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں علماء حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے۔ کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(اقبال نامہ۔ حصہ اول۔ صفحہ ۴۸-۵۱)

اس خط میں علاوہ دیگر امور کے یہ الفاظ کہ "جس میں صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو" حضرت علامہؒ کے مرکزی فکر کی بین شہادت پیش کرتے ہیں۔ وہ قرآنِ خالص کو قانون سازی کی اساس قرار دیتے تھے۔ محترم محمد حسین عرشی صاحب نے علامہ سے اپنی ایک ملاقات کے سلسلہ میں کہا ہے:۔

میں نے پوچھا: اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں؟ فرمایا: "مفصل کہو"۔ میں نے کہا: خارج از قرآن ذخیرہ، احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آ چکا ہے۔ خدائے تعالےٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں[1]

(ملفوظات۔ مرتبہ محمود نظامی۔ صفحہ ۴۵-۴۶)

اسی طرح ایک اور نشست میں، گفتگو کے سلسلہ میں (عرشی صاحب نے) فرمایا ہے کہ ایک صاحب نے آمدِ حضرت مسیحؑ کے ضمن میں حضرت علامہ سے کہا کہ آپ لکھ دیجئے کہ آپ حدیث شریف کے مطابق مسیحؑ کی آمدِ ثانی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا۔ "میرا یہ اعتقاد نہیں ہے"۔ انہوں نے کہا "کیا آپ کو حدیث کی صحت سے انکار ہے؟"۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔

آپ نے فرمایا: "میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو معلوم ہے کہ (یہ کن) ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے۔" (ملفوظات۔ ص ۵۲-۵۱)

اسی طرح انہوں نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "مجھے اس سے انکار ہے کہ حدیث قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے۔" (اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ ص ۱۳۵)

اس قسم کی تصریحات، حضرت علامہ کے مکتوبات اور ملفوظات میں جستہ جستہ مقامات پر بکثرت ملتی ہیں۔ لیکن انہوں نے قانون سازی کے موضوع پر، خطباتِ تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ چونکہ یہ موضوع بڑا اہم اور بنیادی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ بحث بکمال و تمام آپ حضرات کے سامنے آجائے۔ بنا بریں، میں اس خطبہ کے متعلقہ مقامات تفصیلاً پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، قرآن کریم نے انسانی زندگی سے متعلق اصول و اقدار عطا کئے ہیں اور اسے امتِ مسلمہ پر چھوڑا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی جزئیات اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق، باہمی مشاورت سے خود مرتب کرے۔ حضرت علامہؒ اس باب میں تحریر فرماتے ہیں:-

اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور

ثبات و تغیّر کا امتزاج

ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ---- وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ——— تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کونسا اصولِ حرکت کارفرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کُلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

سُنّی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمہ فقہ کے

مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصوّر کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطّل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ میں ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں:

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔

ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:-

> رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (ارلجہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں ..... آ گئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرّا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی

کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات، ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے۔ اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:۔

قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا کہ:۔

> تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افترا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:۔

> اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تغیر نہیں۔

اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں ازبس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ:-

بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔

لیکن انہوں نے کہا کہ:-

بایں ہمہ، میں مسئلہ زیر نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔ سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ قرن اوّل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔

علامہ اقبالؒ کی یہی جسارت تھی جس کی وجہ سے وہ اربابِ دانش کی نگاہوں میں اس قدر واجب التکریم و تحریم بن گئے تھے۔ خود انہی کے الفاظ میں:-

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاء حضرات کی طرف ہوتی ہے، لیکن جب بات ان ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کی جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبداء فیض کی یہ انتہائی کرم گستری تھی کہ اس نے علامہؒ اقبال کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں:-

احادیث کی قانونی حیثیت

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو)۔ انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب

ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، مَیں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا، جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

احادیث کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضورؐ نبی اکرم کو خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، بذریعۂ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکم خداوندی تھا کہ:-

شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ۔ (۳/۱۵۷) ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو۔

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا۔ اور حضورؐ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ:-

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔

یہ طریقِ عمل دورِ خلافت راشدہ میں جاری رہا۔ اُس وقت تک یہ بات کسی کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصوّر خلافتِ راشدہ کے باقی نہ رہنے کے بعد پیدا ہوا۔

احادیثِ رسول اللہؐ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصوّر امام مالکؒ اور ان سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا ـــــــ اس مسلک پر امام ابوحنیفہؒ نے کڑی تنقید کی۔ اور قیاس کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رُو سے اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا ـــــــ علامہ اقبالؒ ان کی اس نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں:-

انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دَور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعمیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ و تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں:-

لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

ان تصریحات سے ـــــــ یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل قرآنی احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے، یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے، ان میں تغیر و تبدّل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہوگی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ:-

وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (ترکی کے) اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے

آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔

رُوحِ عمری رضؓ

وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:-

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:-

اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے اور وہ عالم گیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

یہ ۱۹۲۸ء کی بات تھی۔ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، فرمایا:-

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے، اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان کی اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگے۔

(بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر بابت جنوری۔ فروری ۱۹۷۸ء)

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تشکیلِ پاکستان کے بعد حضرت علامہؒ ہم میں موجود ہوتے تو وہ اپنی اصولوں کے مطابق مملکتِ اسلامیہ پاکستانیہ کے لئے آئین و ضوابط مرتب کر دیتے یا کرا دیتے اور وہ ضابطہ پھر مسلمانوں کی ہر اس مملکت کے لئے جو حقیقی معنوں میں "اسلامی" بننا چاہتی خضرِ راہ ثابت ہوتا۔ اس طرح یہ اُمت ان جکڑ بندیوں سے آزادی حاصل کر لیتی جن میں یہ صدیوں سے محبوس چلی آ رہی ہے۔

اب میں ایک اعتراض کی طرف آرہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصوّر اس لئے دیا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی کسی مملکت میں قرآنی نظام رائج نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جسے قرآنی نظام کی تجربہ گاہ بنایا جائے۔ جب اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام برگ و بار لائے گا تو اس کے قابلِ صد رشک و موجبِ ہزار افتخار نتائج کو دیکھ کر مسلمانوں کی دیگر مملکتیں بھی اس نظام کو اپنے ہاں رائج کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی۔ اور اس کے بعد اس کا بھی امکان ہے کہ اس نظام کے انسانیت ساز اثمار کو دیکھ کر غیر مسلم ممالک بھی اس کی طرف کھنچے چلے آئیں۔ یہ تھی علامہ اقبالؒ کی آرزو، اور مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ۔ لیکن اس تیس سال کے عرصہ میں، نہ تو پاکستان میں قرآنی نظام رائج ہوا اور نہ ہی مسلمانوں کی کسی اور مملکت نے اس کی طرف توجہ کی۔ اس سے معترضین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرت علامہ کی یہ آرزو محض شاعرانہ تخیل پر مبنی تھی۔ قرآن میں کسی زمانہ میں تو اس کی صلاحیت تھی کہ اس کی بنیادوں پر ایک قابلِ عمل نظامِ مملکت وجود میں آجاتا لیکن اب وہ زمانہ لد گیا۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ میں نے اس قسم کے اعتراضات کا تفصیلی جواب اپنے اس خطاب میں دیا ہے جس کا عنوان ہے ——— "کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے"؟ ——— اس مقام پر میں صرف حضرت علامہؒ کی تصریحات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

کیا یہ ممکن العمل بھی ہے؟

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآن، سلسلۂ رشد و ہدایتِ خداوندی کی آخری کڑی ہے جس میں تمام نوعِ انسان کے لئے ابدی حقائق محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ "تمام نوعِ انسان کے لئے" اور "ابدی طور پر" کے معنی یہ ہیں کہ قرآنی راہ نمائی نہ کسی خاص قوم کے لئے مختص ہے اور نہ ہی کسی خاص زمانے تک محدود۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (۳۸/۸۷) کہا ہے۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ ہدایت۔ دوسرے مقام پر اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے۔ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا۔ (۱۴/۲۴-۲۵) اور وہ قانونِ خداوندی کے مطابق، ہر زمانے میں اپنے پھل دیتا جائے۔ حضرت علامہؒ کے الفاظ میں:[1]

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند — بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ (ضربِ کلیم)

اس لئے قرآن کی یہ صورت نہیں کہ کوئی خاص قوم اس پر عمل پیرا نہ ہو یا اسے ترک کر دے تو یہ اپنے نتائج پیدا کرنا چھوڑ دے۔ اگر دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہ رہے جو پانی کی دیگچی کو آگ پر رکھے تو اس سے پانی اپنی اس خاصیت کو کھو نہیں دے گا کہ وہ ایک خاص درجۂ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص اسے آگ پر رکھے گا اس کی مضمر خاصیت مشہود ہو جائے گی۔ قرآنِ مجید ایک عالمگیر ضابطۂ ہدایت ہے۔ دنیا کی جو قوم جس زمانے میں بھی اسے اپنا ضابطۂ زندگی قرار دے گی اس کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ علامہ اقبالؒ نے قرآنی نظام کے قیام کے لئے ہندی مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت کا مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ انہیں اپنی ملّت سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ہزار جان سے

---

[1] یہ خطاب پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

چاہتے تھے کہ اس شجرِ طیب کے حیات آور پھل سب سے پہلے اس کی جھولی میں گریں۔ مسلمانوں سے ان کی عمر بھر یہی تاکید رہی کہ ہر چند یہ اُمت، نکبت و زبوں حالی کا شکار ہے۔ اس میں بظاہر زندگی کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ اس میں کوئی کشش اور جاذبیت باقی نہیں رہی۔ اس کے باوجود، اس کے ساتھ پیوستہ رہنا ضروری ہے۔ بانگِ درا کی وہ نظم بڑی مشہور ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ :۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے — کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور — خالی ہے جیبِ گُل زرِ کامل عیار سے!
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور — رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو — ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ (بانگِ درا۔ صفحہ ۲۸۰)

دوسری جگہ بڑی دلسوزی کے ساتھ کہتے ہیں کہ :۔

کہن شاخے کہ زیرِ سایۂ او پر برآوردی! — چوں برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

اس زوال پذیر اُمت کے ساتھ ان کی یہ محبت تھی جس کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ قرآنی نظام کی نشاۃِ ثانیہ کی آماجگاہ اسی قوم کا صحن ہو۔ لیکن اس کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی یہ تنذیر بھی ان کے سامنے تھی جس میں کہا گیا ہے کہ : وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) "اگر تم نے اس (قرآن) سے اعراض برتا تو خدا تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی"۔ وہ، اپنی قوم کے لئے دل کے نازک ترین گوشوں میں انتہائی جذباتِ محبت، اور دوسری طرف خدا کے اس اٹل قانونِ استبدالِ قومی کو جس انداز سے یک جا پیش کرتے ہیں اس کی مثال کم ملے گی۔ میں اسے بادیدۂ پرنم پیش کرتا ہوں۔ آپ اسے گوشِ نصیحت نیوش کے ساتھ سنئے۔ فرماتے ہیں :۔

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی — از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است — احتیاجِ روم و شام او را کجا است
حق اگر از پیشِ ما برداردش — پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن — ہر زماں جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند (جاوید نامہ۔ صفحہ ۹۲-۹۱)

عزیزانِ من! میں اس موضوع پر بہت کچھ اور بھی کہہ سکتا تھا لیکن قلتِ وقت کی بنا پر اتنے ہی پہ اکتفا کرتا ہوں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کلام و پیامِ اقبالؒ کا مرکز بھی قرآن ہے اور محور بھی قرآن۔ اس کی تعلیم کا عام کرنا ان کی زندگی کا مشن اور ان کا نصب العینِ حیات تھا۔ اور اس کو ایک عملی نظام کی شکل میں متشکل کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا۔ بلاشائبۂ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں قرآنی پیغام اور حقائق کو حسن کارانہ انداز سے اس جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ :-

پیامِ اقبالؒ

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر | بعد ازیں نایدچو من مردِ فقیر

اس لئے کہ :-

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام | شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام
با مسلماناں غمے بخشیدہ ام | کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام
عشقِ من از زندگی دارد سراغ | عقل از صہبائے من روشن ایاغ
نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت! | با مسلماں حرفِ پرسوزے کہ گفت!
ہمچو نے نالیدم اندر کوہ و دشت | تا مقامِ خویش بر من فاش گشت
حرفِ شوق آموختم وا سوختم | آتشِ افسردہ باز افروختم
با من آہِ صبح گاہے دادہ اند | سطوتِ کوہے بکاہے دادہ اند
دارم اندر سینہ نورِ لا الٰہ | در شرابِ من سرورِ لا الٰہ
فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست | جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام

(مسافر۔ ص ۴۴-۴۳)

انہیں خود اس کا احساس تھا کہ انہوں نے کس قدر پیامِ حیات بخش قوم کو دیا ہے اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ ——— اے خنک مردے کہ در عصرِ من است ——— (مسافر ص ۳۳) ——— اس کے بعد سوچئے کہ ہماری شوریدہ بختی کس انتہا تک پہنچ چکی ہے کہ ہم نے اس نوائے حیات آور کی بھی کوئی قدر نہ کی اور اسے قوالوں کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ڈھولک کی تھاپ پر گائیں اور اس خوابیدہ قوم پر سکوتِ مرگ طاری کر دیں۔

"ڈھولک والوں" سے آگے بڑھ کر ہم، (نام نہاد) دانشوروں کے کوچے میں آتے ہیں تو وہاں ہمیں اس سے بھی زیادہ تاسف انگیز صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حضرات کی بارگاہ سے، علامہ اقبالؒ کو جو سب سے بڑا خطاب عطا ہوا، وہ "شاعرِ مشرق" کا تھا۔ اس خطاب کا اس شدومد سے چرچا کیا گیا کہ وہ اب ساری دنیا میں اسی حیثیت سے متعارف ہیں۔ آپ ذرا سوچئے کہ اگر کوئی مفکر اپنی حاصلِ فکر کا اظہار نثر میں کرے تو ہم اسے نثر نگاروں کی صف میں نہیں کھڑا کرتے۔ اسے مفکر ہی کہتے ہیں۔ لیکن اگر وہی مفکر، اپنی فکر کو زبانِ شعر میں پیش کرتا ہے تو ہم اسے مفکر نہیں کہتے شاعر کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اسی ستم ظریفی کا شکار ہیں۔ وہ عمر بھر کانوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر پکارتے (بلکہ چلاتے)

میں شاعر نہیں !

رہے کہ بابا! میں شاعر نہیں۔ مجھے شاعری سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن ان کے ستائش گر انہیں جھٹلاتے چلے جاتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ نہیں کچھ علم نہیں۔ تم شاعر ہو۔ اور بہت بڑے شاعر۔ علامہؒ نے اپنے پہلے مجموعہ نظم (پیامِ مشرق) کے ابتدائیہ میں کہا تھا کہ :-

آشنائے من زمن بیگانہ رفت ۔۔۔ از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دھم ۔۔۔ تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد زمن ۔۔۔ رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن
کم نظر بے تابیٔ جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید ۔۔۔ (پیامِ مشرق ص۳)

اقبالؒ کے نام لیوا بالعموم اس کے "آشکار" کے گرویدہ رہے۔ اس کے "پنہان" تک کسی کی نگاہ نہ گئی۔ جن کی نگاہ اس کے "پنہان" تک پہنچی تھی انہوں نے برملا کہا تھا کہ :-

پردۂ تو از نوائے شاعری است ۔۔۔ آنچہ گوئی ماورائے شاعری است

(غنی کاشمیری - در - جاوید نامہ ص۱۹۵)

حضرت علامہؒ نے خود، سید سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھا تھا :-

> میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ (مکتوبات حصہ اوّل - ص۱۹۵)

دیکھئے! وہ انہیں شاعر سمجھنے اور کہنے والوں کو کن الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ زبورِ عجم میں ہے :-

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم ۔۔۔ مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست ۔۔۔ کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست ۔۔۔ (ص۲۰۴)

اور جب یہ حضرات اس پر بھی باز نہیں آتے، تو وہ اس بارگاہ میں فریاد لے کر پہنچتے ہیں جس سے بلند بارگاہ ان کے نزدیک کوئی نہیں۔ دیکھئے وہ کس درد و سوز سے فریاد کرتے ہیں کہ :-

بآں رازے کہ گفتم، پے نبردند ۔۔۔ زشاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ امم! داد از تو خواہم ۔۔۔ مرا یاراں غزل خوانے شمردند ۔۔۔ (ارمغانِ حجاز ص۵۴)

اور اس کے بعد کہتے ہیں :-

نہ شعر است ایں کہ بر وے دل نہادم ۔۔۔ گرہ از رشتۂ معنیٰ کشادم
بامیدے کہ اکسیرے زند عشق ۔۔۔ مسِ ایں مفلساں را تاب دادم ۔۔۔ (ص۵۵)

اور پھر یہ فریاد کہ :-

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوے ۔۔۔ بگوشِ مُردہ پیغامِ جاں گوے

ولے گوینہ ایں حق نا شناسے | کہ تاریخِ وفاتِ ایں و آں گوئے | (صفحہ ۵)

وہ گلشنِ اقبالؒ کے متعلق کہتے ہیں کہ :-

آنچہ گفتم از جہانے دیگر است | ایں کتاب از آسمانے دیگر است۔ | (جاوید نامہ صفحہ ۶)

اس میں شبہ نہیں کہ اقبالؒ نے جو کچھ کہا وہ "از جہانِ دیگر" تھا۔ شاعری نہیں تھا۔ لیکن یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انہوں نے شاعری کو جو بطور ذریعۂ ابلاغ اختیار کیا (خواہ اس کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ تھا) اس سے ان کا پیغام وہ نتائج مرتب نہ کر سکا جو ان کا مدعا تھا۔ اس کے برعکس قوم نے اس کا غلط استعمال بھی کیا اور اُلٹا اثر بھی لیا۔ یہ اس لئے کہ آپ لاکھ کوشش کیجئے، شاعری "ڈھولک" سے الگ رہ نہیں سکتی اور ان دونوں کا آمیزہ اور عصارہ، افیون بن جاتا ہے۔ یہ وہ آمیزہ ہے جس کے متعلق خود علامہ نے (ابلیس کی زبان سے) کہلوایا ہے کہ :-

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی | ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علمِ کلام | (ارمغانِ حجاز صفحہ ۲۱۶)

اس کے باوجود، پیغامِ اقبالؒ کو اگر اس کی فکر کے سرچشمہ، قرآنِ مجید کی روشنی میں سمجھا جاتا، تو اس سے ہماری قوم حیاتِ تازہ سے ہمکنار ہو سکتی تھی۔ لیکن قوم نے ایسا نہ کیا اور اس پر سکوتِ مرگ طاری رہا۔ اسے بھی سمجھ لیجئے کہ اگر قوم نے ایسا نہیں کیا تو یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ یہ ایک گہری سازش کا نتیجہ تھا جس کا تانا بانا کہیں اور بُنا گیا تھا۔ (جیسا کہ حضرت علامہؒ نے اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں کہا ہے) جہانِ ابلیس۔ یعنی مغرب کی استعماری قوتیں خوب سمجھتی تھیں کہ اگر دنیا کے کسی خطہ میں بھی قرآنی نظام قائم ہو گیا تو وہ ان کے لئے پیغامِ موت ہوگا۔ اس لئے ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ ـــــ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں ـــــ پاکستان ان قوتوں کو اس نظام کی اوّلین آماجگاہ بنتا نظر آتا تھا کیونکہ یہی علامہ اقبالؒ کے پیغام کا اوّلین مخاطب تھا۔ اور تجربہ گاہ تھا۔ چنانچہ ان قوتوں نے اپنی انتہائی لطیف فریب کاری سے کام لیتے ہوئے ایسا انتظام کیا کہ یہاں قرآن کا نام تو بیشک لیا جائے لیکن اس کا 'پیغام' عام نہ ہونے پائے۔ اور چونکہ اقبالؒ بھی قرآن کا پیامبر تھا اس لئے یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ اقبالؒ کو بھی اس کا صحیح مقام نہ مل سکے۔ ان کی یہ سازش بڑی کامیاب رہی ہے۔ اقبالؒ یہاں محض ایک شاعر بن کر رہ گیا ہے۔ قرآنی آواز طلوعِ اسلام کے مرکز سے اٹھتی تھی۔ اس کے خلاف اس قسم کا منظم پراپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ وہ الحاد اور بے دینی کے مرادف قرار پا گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں مایوس نہیں اور قرآن کے پیغام اور اس کی روشنی میں، فکرِ اقبالؒ کو عام کئے جا رہا ہوں۔ میں محض اپنے قیاس کی بنا پر یہ فیصلہ کیوں کر لوں کہ قوم اب زندہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اور پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاؤں۔ یہ بھی تو قرآن کی روشنی میں، اقبالؒ ہی نے کہا تھا کہ :-

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو است | زندگانی محکم از لا تقنطوا است
تا امید از آرزوئے پیہم است | نا امیدی زندگانی را سم است
زندگی را یاس خواب آور بود | ایں دلیلِ سستئ عنصر بود
از دمش میرد قوائے زندگی | خشک گردد چشمہ ہائے زندگی | (اسرار و رموز صفحہ ۱۰۸)

قرآن کی یہی تشدید یاس افزا ہے جو اس طول طویل سفرِ زندگی میں مجھے تھکنے نہیں دیتی، اور قدم قدم پر یہ کہہ کر میرا حوصلہ جوان کر دیتی ہے کہ :-

مسلم استی! سینہ را از آرزو آباد دار | ہر زماں پیشِ نظر، لا یخلف المیعاد دار

والسلام